غالب کے خطوط

کوثر چاندپوری

خطوط نگاری کو اس حیثیت سے ادب میں خاص اہمیت حاصل ہے کہ خطوں میں لکھنے والے کی شخصیت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے وہ جو کچھ لکھتا ہے یہ سمجھ کر لکھتا ہے کہ وہ اس کی ذاتی چیز ہے اس لیے پوری بے تکلفی سے اپنی ذات کو عُریاں کر دیتا ہے کوئی ایسا پردہ نہیں ہوتا جو اس وقت اُٹھ نہ جائے۔ انسانی سیرت کا ہر پرت کُھل جاتا ہے لکھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے جیسے سونے کے کمرے میں پہنچ گیا ہے جہاں کوئی اسے دیکھنے والا نہیں، خط لکھنا درحقیقت باتیں کرنے کے مترادف ہے۔ ایک ادیب اظہار خیال کا وہ طریقہ اختیار کرتا ہے جو باتیں کرتے وقت اُسے اختیار کرنا چاہیے۔ غالب ادیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ شاعری میں اُن کا اسلوبِ بیان بالکل اچھوتا اور منفرد ہے۔ نثر نگاری میں انھوں نے انفرادیت کو برقرار رکھا ہے، بلکہ نثر میں ایک نئے لہجہ کی طرزِ نگارش کی بنیاد ڈالی ہے، غالب کے خطوط میں ان کی شخصیت کا عکس پوری نایانی کے ساتھ جھلکتا ہے۔ اتنا صاف اور نمایاں عکس اشعار میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کی شاعری میں فنی فکر اور تخیل کا نہایت حسین امتزاج ہے۔ ان کا اسلوب اور طرزِ بیان بھی مخصوص بلندی کا حامل ہے، جس کو خود انھوں نے اختراع کیا ہے۔ اسی لیے ان کے اشعار میں غیر معمولی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو اظہار شخصیت کے منافی ہے۔ شخصیت بہت چھوٹے اور معمولی واقعات ہی میں ظاہر ہوا کرتی ہے۔ اس قسم کے واقعات ان کے اشعار میں نہیں خطوط میں ملتے ہیں۔ خطوں میں غالب کی سیرت اور شخصیت کے سارے خول اُتر جاتے ہیں۔ ان کا بال بال نظر آنے لگتا ہے۔ خط و خال بالکل نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے غالب کے خطوط کو اُردو نثر میں بے نظیر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اظہارِ شخصیت کے نقطۂ نظر سے اُردو کے ادبی ذخیرے میں ان خطوط کی مثال نہیں مل سکتی۔ جس وقت غالب کی نثر نگاری کا آغاز ہوا ہے، فورٹ ولیم کالج میں زبان کو آسان اور رواں بنانے کی کوششیں بروئے کار آ چکی تھیں۔ یوں بھی انگریزی تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تکلف، آورد اور مبالغہ کا اثر کم ہونے لگا تھا۔ غالب جدید تہذیب کے ابتدا ہی سے پرستار تھے۔ وہ نہ صرف اس معاشرت ہی کے دلدادہ تھے، بلکہ انگریزوں کے بہت بڑے مدّاح بھی تھے۔ اس اعتبار سے انھیں انگریز پسند کہنا غلط نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے میں غالب کی اُردو نثر کے اس نئے اسلوب میں بھی انگریز پسندی کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے بہت دشوار پسند تھے۔ ابتدائی شاعری سے اس رجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ بیدل کی تقلید میں ایسے اشعار کہہ رہے تھے جن کا سمجھنا نہ صرف مشکل ہی تھا بلکہ اکثر اوقات وہ معمّہ بن جایا کرتے تھے۔ نسخہ حمیدیہ میں اس قسم کے اشعار بھی ملتے ہیں جن کو اندازِ بیان اور مشکل پسندی نے مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ مثلاً:

صبحِ قیامت ایک دُمِ گرگ تھی اسد . جس دشت میں وہ شوخ دو عالم شکار تھا

شیشۂ آتشیں رُخِ پُر نور　　　　عرق از خط کشیدہ روغن نور

لیکن سماج نے ہر دور میں ایک ایسی درسگاہ کا کام دیا ہے جس میں فطرتِ انسانی کے پیچ وخم درست ہو جاتے ہیں۔ اسی نے غالب کو مولوی فضل حق اور مفتی صدر الدین آزردہ ایسے نقاد دیے جن کے فیضِ صحبت نے ان کے ذہن وشعور میں وقت کے مطالبات کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔ غالب کے ذہن میں خود ان کے بیان کے مطابق کسی قسم کی کجی نہیں تھی۔ جلد ہی انھوں نے شعر گوئی کا سانچہ تبدیل کر دیا اور وہ آہنگ اختیار کیا جس نے ان کی عظمت اور مقبولیت کو دوام بخش دیا اور علامہ اقبال کو یہ کہنا پڑا کہ

شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

بہر حال غالب نہایت ذہین اور جینیس تھے۔ وقت اور سماج کے تقاضوں پر نظر رکھتے تھے۔ ان دونوں کے تیور بدل رہے تھے۔ کلکتہ میں ایک شمع جل چکی تھی۔ غالب نے اس کی روشنی میں مستقبل کا دمکتا ہوا چہرہ دیکھ لیا۔ اب تک وہ بیدل کے رنگ میں جو کچھ کہہ رہے تھے اسے عوام ہی نہیں خواص بھی نہ سمجھتے تھے۔ مشاعروں میں ان کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ غالب نے ان حالات پر دانشورانہ انداز سے غور کیا اور تنقید کی اہمیت کو سمجھا جس کے نتیجہ میں طرزِ فکر بدل گیا۔ اس کے بعد انھوں نے جو اشعار کہے وہ اسلوب، طرزِ ادا، ندرتِ خیال اور جدتِ فکر کے اعتبار سے اُردو شاعری کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ نثر کی صورت بھی نظم سے مختلف نہیں ہے۔ مہرِ نیم روز میں غالب نے جو اندازِ نگارش اختیار کیا تھا وہ بہت مشکل تھا۔ شاہ ظفر نے اس رنگ کو پسند نہیں کیا۔ اسی وجہ سے کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ اور سلسلۂ تالیف منقطع ہو گیا۔ پنج آہنگ میں فارسی کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں ان میں بھی بہت پیچیدہ اور مشکل زبان اختیار کی گئی ہے ہر چند عام طور پر القاب وغیرہ کو زیادہ طول نہیں دیا گیا لیکن طرزِ بیان آسان نہیں، نہ ان میں گفتگو اور بات چیت کا وہ سلیقہ پیدا ہو سکا جو غالب کے اُردو خطوط کی نہایت اہم اور حسین خصوصیت ہے۔ میر اعظم علی مدرس، مدرسہ اکبر آباد کے نام لکھے ہوئے ایک مکتوب کا آغاز دیکھیے:

امروز شرارہ بداغم زدہ اند
نشتر برگِ صبر فراغم زدہ اند
از کثرتِ شورِ عطسہ مغزم ریش است
تا عطر چہ فتنہ بر دماغم زدہ اند

جنبش خامہ عیسوی ہنگامہ مطالعِ مکرم مخدوم اعظم را۔ نازم کہ با حیائی ہوسہائی مردہ ساحتِ خاطر را عرصۂ محشر ساخت و بازار رستخیز گرم کرد۔ خار خار دیریں آرزوہا سر از دل بدر آورد۔ بیاد آمد کہ پیش ازیں مراہم در گیستی وطنی ہا از مہربانان انجمنی بودہ است چوں نشتر پرستش بمغز اندیشہ فرو بردہ اند۔ خوں چکانے نواہا تماشا کردنی است　　　　(کلیات نثر فارسی ۱۰۳)

اُردو میں نومبر ۱۸۵۸ء کے بعد جو خطوط لکھے گئے ہیں ان میں اور پنج آہنگ کے فارسی مکتوبات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ تفاوت نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے اور بعد کے لکھے ہوئے اُردو خطوط میں بھی موجود ہے۔ غالب جس معاشرے کے فرد تھے اس میں فکر و خیال کی بلند پروازیاں برداشت کی جاسکتی تھیں بہت مشکل اور دقیق طرزِ اظہار پسند نہیں کیا جاسکتا تھا۔ غالب وقت کے تقاضوں کو سمجھ رہے تھے۔ وہ سماج کے ساتھ تبدیل ہونے ہی کو فن کاری کی دانشورانہ خصوصیت خیال کرتے تھے۔ تبدیلی کا یہ رجحان ان کا فطرت کا حصّہ تھا، ان کی ابتدائی شاعری کا ایک شعر ہے ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

اس سے غالب کی ذہنی تبدیلی اور مذہبی و فکری نقطۂ نظر میں واضح ارتقا کا ثبوت ملتا ہے۔ شروع میں انھوں نے کسی جفا پیشہ محبوب کے عشق میں اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا تھا اس وقت بڑی جرأت مندی کے ساتھ کہا تھا۔

اس جفا مشرب پہ مرتا ہوں کہ سمجھے ہے اسدؔ
خُونِ سُنّی کو مباح اور مالِ صوفی کو حرام

تغیر پسند فطرت نے غالب کو اس منزل پر بھی ٹھہرنے نہیں دیا۔ اگرچہ انھوں نے آگے چل کر اپنا مشرب نہیں بدلا لیکن اکابرِ مذہب کے ساتھ عقیدت کا غلو پسندِ خاطر نہیں رہا۔ حضرت علیؓ کی ذاتِ گرامی سے غالب کو انتہائی شیفتگی تھی، بعض غزلوں کے مقطعوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں جناب امیر کی محبّت کا جام چھلک رہا ہے۔

یا علی یک نگاہ سوئے اسدؔ — میں غریب ہوں اور تو غریب نواز
دھوئیں سے آگ کے اک ابر دریا بار ہو پیدا — اسدؔ حیدر پرستوں سے اگر ہوتے دوچار آتش
غالبؔ ہے رتبہ فہم تصوّر سے کچھ پرے — ہے عجز بندگی جو علیؓ کو خدا کہوں
اسدؔ گر نام والائے علیؓ تعویذ بازو ہو — غریقِ بحرِ خوں در آئینہ رہتا ہے

اس والہانہ عقیدت میں اس وقت کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔ جب بعض مقطعوں میں لفظی ترمیم نظر آتی ہے۔ مثلاً

مجھ کو پُوچھا تو کچھ غضب نہ ہُوا — میں غریب اور تُو غریب نواز

یہ ایک طرح کا ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ضرور ہے اس سے غالب کی وسیع النظری کا سراغ بھی ملتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مذہب پرست حضرات اس عقلیت پرستی سے اتفاق نہ کریں۔

ذہانت، وسیع النظری، فراخدلی اور جدّت پسندی کے عناصر غالب کی نظم و نثر میں ہر جگہ موجود ہیں۔ خطوط میں ان چیزوں کا حسن بہت نمایاں ہو گیا ہے۔ اُردو خطوط پر کچھ لکھنے سے قبل میں غالب کا ایک منظوم مکتوب پیش کرتا ہوں جو فارسی میں جواہر سنگھ جوہر پسر رائے چھجمل کو لکھا گیا ہے اور عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا۔ جواہر سنگھ سے غالب کے روابط بزرگانہ تھے۔ اس خط میں اسی قسم کے مشفقانہ جذبات نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جواہر اور رائے چھجمل کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ جواہر سنگھ

باپ سے خوش نہیں تھے۔ اسی وجہ سے واپس نہیں آ رہے تھے۔ ماں باپ دونوں بیٹے کی مفارقت میں تڑپ رہے تھے۔ یہ خط جناب مسلم ضیائی کو کلیات غالب فارسی پر لکھا ہوا ملا تھا۔ شروع میں یہ عبارت مرقوم تھی۔

مرزا اسد اللہ بہ لالہ جواہر سنگھ

نوشتہ بودند

وفا جوہرا از تو غم دور باد — دلت سرخوش بادۂ سور باد

رسید از تو اُلفت فزو نامہ — رواں تازہ کن (کذا) دلکشا نامہ

زر بخوریِ من مخور غم کہ من — ندارم غمِ ہستیِ خویشتن

نہ جاں از من است و نہ جسم آنِ من — خود از مردنِ من چہ نقصانِ من

حدیثی (۱) ست شائستہ و سودمند — زشائستگی بودہ دانا پسند

گر از من بناشی نکوئی شنو — ز آنکس کہ فرزند ادمی شنو

چنیں داردہ فرماں کہ در سازراہ — بناشی بہ حیلت گری عذرخواہ

عزیزانِ رہبرد گرامی کنند — بشادی دراں ناحیت می رسند

بہ شادی بدیں جمع انباز گرد — چو گردندِ ایناں تو ہم باز گرد

الا تا نسنجی دریں زاں بہ است — چنیں خواستست آں کہ فرماں دہ است

مشو سخت کوش و مشو سخت گیر — دریں آمدن باش فرماں پذیر

بحکم پدر چو (ول) گزیدی سفر — بگرد از سفر ہم بہ حکم پدر

دریں رفتن و آمدن شاد باش — بہ تبعیت از طعنہ آزاد باش

ز ہجر تو مادر بہ تاب اندر است — گزراں چو شکر در آب اندر است

پدر نیز مشتاق دیدار تست — بصد گونہ خواہش طلبگار تست

ترا خواہد از بسکہ خواہد ترا — نخواہد دگر او بس کہ خواہد ترا[1]

بیاد دو خونیں جگر را ببیں — بمادر نشیں و پدر را ببیں

دگر من چراغ سحر گاہیم — قدم نہ براہ ہوا خواہیم

بیا تا بہ بینی کہ چوں می تپم — چساں دیدہ تا دل بخوں می تپم

بیا تا تنم غرق خوں بنگری — درونِ مرا از بروں بنگری

بیا و بیا و بیا و بیا — برآمد سخن والدعا والدعا

بخواں چوں بخوانی ورق را تمام — ز غیر سلام و ز عارف سلام

---

[1] نخواہد دگر بس کہ خواہد ترا

اگرچہ اس نامۂ منظوم پر تاریخ درج نہیں ہے۔ تاہم یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اس وقت لکھا گیا ہوگا جب غالب احباب و اعزہ کو فارسی ہی میں لکھا کرتے تھے۔ جواہر سنگھ کے نام چند اُردو مکتوبات بھی لکھے گئے ہیں۔ ۱۸۵۳ء میں غالب نے انھیں ایک خط لکھا ہے جس میں لالہ چھج مل کی کی بیماری کا حال قلمبند کرتے ہوئے انھیں کچھ بھیجنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

"ہاں لالہ چھج مل اکثر بیمار رہتے ہیں۔ ان دنوں میں خصوصاً اس شدت سے نزلہ چھاتی پر گرا کہ دم گھبرا گئے اور زیست کی توقع جاتی رہی بارے کچھ فرصت ہوگئی ہے۔ بھائی یہ آفتاب سرگروہ ہیں۔ ہیرا کا ان کے پاس رہنا اچھا ہے تم سے جو ہو سکے گا تم اوس کے مصارف کے واسطے مقرر کردو گے"

خطوط غالب کے دو مجموعے ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو گئے تھے یعنی عود ہندی اور اُردوئے معلیٰ۔ عود ہندی ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو منظرِ عام پر آگیا تھا۔ غالب کو ابتداءً خطوط کی اشاعت ناگوار تھی۔ سب سے پہلے منشی شیو نرائن کے دماغ میں انھیں شائع کرنے کا خیال آیا۔ انھوں نے غالب کو متوجہ کیا۔ ۱۶ نومبر ۱۸۵۸ء کو غالب نے منشی صاحب کو ایک خط لکھا جس میں خطوط کی اشاعت پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا تھا۔

"اُردو کے رقعات بھی جو آپ چھاپا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے اوس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا جانا میرے خلافِ طبع ہے"

اس تحریک میں منشی ہرگوپال تفتہ بھی شریک تھے۔ غالب نے ان کے نام بھی اسی قسم کا خط لکھا:

"رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمھاری اس میں خوشی ہے تو مجھ سے نہ پوچھو تم کو اختیار ہے۔"

اس کے بعد ان دونوں حضرات نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور رقعات شائع کرنے کی جسارت نہیں کی۔ لیکن وہ راز ہائے سربستہ جن میں رونق بزم و انجمن بننے کی صلاحیت ہوتی ہے کسی کوشش سے پوشیدہ نہیں رہا کرتے ظاہر ہو کر ہی رہتے ہیں۔

کجا ماند آں رازے کز و سازند محفلہا

غالب کے ان رقعات کو اُردو نثر میں سنگ میل کی حیثیت سے سامنے آنا تھا۔ ان میں غالب کی شخصیت کا حسن تھا۔ ان کی مسرتیں اور سوگواریاں تھیں۔ زمانہ کی عکاسی تھی۔ ان سب چیزوں کی طاقت ہی تھی جس نے خطوط غالب کو پریس تک پہنچا دیا۔ ۱۸۶۱ء میں چودھری عبدالغفور مارہروی نے چاہا کہ ان کے نام غالب کے جو مکتوبات آتے ہیں انھیں شائع کر دیا جائے۔ ابھی یہ خطوط اشاعت پذیر نہ ہوئے تھے کہ چودھری صاحب نے انھیں ایک ایسے جلسے میں پڑھ دیا جہاں منشی ممتاز علی خاں مالک مطبع مجتبائی بھی موجود تھے۔ انھوں نے چودھری صاحب سے کہا کہ اگر ان خطوط کو مرتب کر دیا جائے تو میں چھاپ دوں گا۔ چنانچہ رقعات کو مہر غالب کے تاریخی نام سے کتابی شکل میں یکجا کر دیا گیا۔ طباعت سے قبل منشی ممتاز علی خاں کو خیال ہوا کہ غالب کے خطوط جو ان کے دوسرے احباب کے پاس آتے ہیں اگر اسی مجموعے میں شامل کر دیے جائیں تو افادیت میں اضافہ ہو جائے گا۔ انھوں نے اسی وقت سے رقعات کی تلاش و جستجو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسی دوران میں پتہ چلا کہ خواجہ غلام غوث مرزا کے تعاون سے ان کے خطوط جمع کر رہے ہیں۔ منشی ممتاز علی نے کوشش کر کے ان کو بھی حاصل کر لیا اور ان تمام رقعات

کو ملا کر ایک مجموعہ مرتب کر لیا گیا۔ اس کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ پورے آٹھ سال تک مسودہ پریس نہ جا سکا۔ غالب جو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ رقعات ۱۸۶۳ء میں چھپ جائیں گے اس تعویق پر بہت بے چین ہوئے۔ انھوں نے بے خبر کی خبر لے ڈالی اور انھیں لکھا:

> اور ہاں حضرت! وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح یا چھُپے گا بالضم چھپ چکا ہے تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت اقتضا کرے فقیر کو بھیجیے۔

بے خبر کی خواہش تھی کہ دیباچہ غالب ہی لکھیں وہ کسی طرح تیار نہ ہوتے تو مجبوراً مسودہ منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیا گیا۔ انھوں نے سرور اور بے خبر کے رقعات پر آپ ہی دیباچہ لکھا اور کتاب عود ہندی کے نام سے شائع ہوگئی۔ دوسرا مجموعہ اردوئے معلی سے موسوم ہو کر غالب کی وفات کے تین ہفتہ بعد ۱۸۶۹ء کو شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۶ مارچ ۱۸۹۹ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں نواب رام پور کے نام لکھے ہوئے تمام خطوط جو اب تک غیر مطبوعہ تھے "مکاتیب غالب" کے نام سے چھاپے گئے۔

ان مجموعوں میں جس قدر خطوط شامل ہیں ان سب میں غالب کی شخصیت پوری رعنائی اور دلکشی کے ساتھ چلتی پھرتی، بولتی چالتی، روتی بسورتی اور مسکراتی بلکہ قہقہے لگاتی نظر آتی ہے۔ وہ القاب و آداب کا سہارا لیے بغیر بڑی برجستگی اور بے تکلفی سے میاں حضرت یا کوئی ایسا ہی ہلکا پھلکا لفظ سرنامہ پر لکھ کر اظہار مطلب شروع کر دیتے ہیں۔ تحریر میں آمد ہی آمد ہوتی ہے آورد کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوتا۔ دلی کی جس نکھری ستھری روزمرہ میں وہ بات چیت کیا کرتے تھے اسی کو سپرد قلم کر دیتے ہیں۔ اپنی مکتوب نگاری کے متعلق غالب کا بیان ہے کہ

> میرا طریقہ یہ ہے کہ جب خط لکھنے کے لیے قلم و کاغذ اٹھاتا ہوں تو مکتوب الیہ کو کسی ایسے لفظ سے جو اس کی حالت کے موافق ہوتا ہے پکارتا ہوں اور اس کے بعد ہی مطلب شروع کر دیتا ہوں۔ القاب و آداب کا پرانا طریقہ اور شکوہ شکوہ، شادی و غم کا قدیم رویہ میں نے بالکل اُٹھا دیا۔

غالب کی خطوط نگاری اور اس کے انداز پر مختلف پہلوؤں سے اظہار خیال کیا گیا ہے لیکن اس حقیقت کو سب نے تسلیم کیا ہے کہ غالب کے مراسلوں میں مکالمہ کا لطف ہے، غالب کا اپنا دعویٰ بھی یہی ہے۔ البتہ جو لوگ یہ لکھتے ہیں کہ یہ خطوط بلا ارادہ لکھے گئے ہیں وہ ذرا مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ خود غالب نے اپنے خط میں اتنی بات تو تسلیم کر ہی لی ہے کہ بعض رقعات قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے گئے ہیں اور یہ کیفیت اُس وقت تھی جب خطوط کے چھپنے کا تصور بھی ذہن میں نہ تھا۔ جس وقت یہ امر واضح ہو گیا کہ رقعات کا چھپنا لازمی ہے تو بعد کے خطوط پر یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ بغیر سوچے سمجھے لکھے گئے ہیں۔ غالب کے نزدیک سخن گوئی میں جو ایک قسم کا شکوہ پایا جاتا ہے وہ انھیں بہت عزیز تھا اسی میں وہ اپنی انفرادیت کی جھلک دیکھتے تھے۔ ناممکن ہے کہ اس آبگینہ کو سنبھالنے کا خیال کسی وقت ان کے دل سے نکل گیا ہو۔ غالب نے خطوط زیادہ تر اُس وقت لکھے ہیں جب ان کا ادبی شعور پختہ ہو چکا تھا۔ سن و سال کے اعتبار سے بھی وہ پختگی بلکہ سالخوردگی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ اس عمر میں سرسری باتیں نہیں کی جایا کرتیں۔ غالب کو ہر وقت اپنی شہرت اور شوکت سخنوری کا خیال رہتا تھا وہ کسی صورت میں بھی قلم سنبھالے بغیر خط نہیں لکھ سکتے تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی غالب کے خطوط کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اُردو نثر میں غالب نے جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ صرف ان کے خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ خطوط بھی کسی منصوبے کے ماتحت

نہیں لکھے گئے ہیں"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

"یہ خطوط چونکہ نجی اور ذاتی ہیں اور انھیں اس احساس سے نہیں لکھا گیا ہے کہ ان کا شمار ادبی تخلیق کے تحت ہوگا اس لیے ان میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔" (افکار کراچی، شمارہ ۱۱۴)

ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کو تسلیم کرنا مشکل ہے۔ یہ نجی اور ذاتی خطوط عام طور پر دوستوں اور شاگردوں کو لکھے گئے ہیں۔ بعض میں ادبی مباحث پر بھی گفتگو ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ غالب کو ان تحریروں کو ادبی تخلیق کا درجہ دینے سے بے خبر تھے، انھوں نے ادبی تخلیق کا مرتبہ ضرور دینا چاہا۔ خاص طور پر اس وقت تو یقیناً ایسا سوچا گیا۔ جب رقعات کے چھپنے کا سلسلہ شروع ہوگیا، پہلے غالب نے رقعات کی اشاعت سے اختلاف کیا تھا پھر وہ اپنی ان ادبی تخلیقات کی اشاعت کے لیے بے چین رہنے لگے اور خطوط کے چھپنے میں جو تاخیر ہوئی اس پر وہ مضطرب ہو گئے۔ اپنی کتابوں کے مطبوعہ ایڈیشنوں کے انتظار میں وہ ایک خاص قسم کا کرب محسوس کرنے کے عادی تھے۔ اس عالم میں ان کی فطری عجلت پسندی الفاظ کے قالب میں ڈھل کر خطوں میں نمایاں ہو جایا کرتی تھی اس قسم کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ دستنبو کی طباعت کے سلسلہ میں غالب نے منشی شیو نرائن آرام کو متعدد خطوط لکھے ہیں۔ ایک خط کے اقتباسات دیکھیے:

"صاحب کتابیں کب روانہ ہوں گی۔ دوالی بھی ہولی اگر گنگا جانے کا قصد ہو تو بھائی میری کتابیں بھیج کر جانا۔

جواب لکھو اور شتاب لکھو کتابیں بھیجو اور جلد بھیجو۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"اور وہ کتاب میرے پاس جلد پہنچ جاتے تو بہتر ہے۔"

دستنبو کی طرح غالب کو خطوط چھپنے کا بھی شدید انتظار تھا اگر ان کی نگاہ میں رقعات کی حیثیت ادبی تخلیق کی نہ ہوتی تو ہرگز یہ بات نہ ہوتی۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

"لیکن مرزا غالب کے خطوط کے متعلق یہ خیال غلط ہے کہ وہ بے تکلف دوستانہ خطوط ہیں اور انھیں لکھتے وقت مرزا کو ان کی اشاعت کا خیال نہیں تھا۔" (غالب نامہ صفحہ ۴۸)

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ نومبر ۵۸ء کے بعد جو خطوط لکھے گئے ہیں ان میں غالب نے قلم کو بہت سنبھالا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے دماغ میں خطوط کے چھپنے کا خیال موجود تھا۔ ان خطوط میں بے ساختگی اور برجستگی کا وہ رنگ ملتا ہے جو انھیں ایک شعوری تخلیق کا درجہ دینے پر مجبور کرتا ہے۔ مرزا تفتہ کے نام غالب کے بہت سے خطوط ہیں جن میں سے بعض میں القاب کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بغیر کسی سہارے ہی کے خط شروع کر دیا گیا ہے، اس قسم کے خطوط سے خلوص و محبت کا وہ رس ٹپکتا ہے جو میٹھا بھی ہے اور شفاف بھی۔ اسی کے ساتھ ان میں وہ انسان بولتا محسوس ہوتا ہے جس کا کوئی مذہب نہیں۔ وہ صرف

انسانیت کا پجاری ہے، انسان ہی اس کا مخاطب اور اس کے فن کا موضوع ہے، ایک خط یوں شروع ہوتا ہے۔

"واہ کیا خوبی قسمت ہے میری، بہت دن سے دھیان لگا ہوا تھا کہ اب منشی جی کا خط آتا ہے اور ان کی خیروعافیت معلوم ہوتی ہے خط آیا اور خیروعافیت معلوم ہوئی، یعنی معلوم ہوا کہ خیر نہیں ہے اور پاؤں میں چوٹ لگی۔ سو صاحب یہ بھی غنیمت ہے کہ ہڈی کو صدمہ نہیں پہنچا۔ اتنا پھیلاو بھی اس سبب سے ہوا کہ کوئی مالش کرنے والا نہ ملا اور چوٹ کہنہ ہوگئی۔ البتہ کچھ دیر میں افاقت ہوگی۔ بعد افاقت ہونے کے تم مجھ کو اطلاع کرنے میں دیر نہ کرنا۔ میرا دھیان لگا ہوا ہے۔" (خطوط غالب صفحہ ۷۴)

غالب کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی جدت طرازی سے مکتوب نگاری کا قدیم اسلوب یکسر بدل دیا۔ وہ پرانی شاہراہ کو چھوڑ کر اپنی ہی بنائی ہوئی ڈگر پر چلے۔ جس کے سنگ میل بھی نئے ہیں اور منزلیں بھی انوکھی ہیں۔ ان کے تیار کیے ہوئے اس جادہ پر انھیں کے نقوش قدم ہیں۔ ان سے قبل کوئی کارواں نہیں گذرا۔ غالب کے خطوط میں غدر کے بعد کی وہ مکمل تصویر ملتی ہے جس میں دہلی والوں کے افسردہ اور مغموم چہرے بھی نظر آتے ہیں اور اس کے اوراق مصور کی ویرانی اور سوگواری بھی ملتی ہے وہ جو کچھ لکھتے ہیں دل نشین بھی ہوتا ہے اور اثر انگیز بھی، کہیں کہیں تو ایسا لگتا ہے کہ غالب نے خون دل میں انگلیاں ڈبوئی ہیں غالب دلی کی روزمرہ میں ایسی باتیں لکھتے ہیں جو دل میں گھر کر لیتی ہیں اور خود ان کا قلم الفاظ کے بوسے لینے لگتا ہے۔ غالب نے اپنی نجی زندگی کی عکاسی میں بھی بڑی فن کاری سے کام لیا ہے۔ وہ اپنی کسی بات کو پردے میں نہیں رکھتے۔ کہیں سے روپیہ آجاتا ہے کو خرچ کی پوری تفصیل بھی مکتوب الیہ کو لکھ دیتے ہیں۔ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"بدھ کا دن تیسری تاریخ فروری کی ڈیڑھ پہر دن باقی رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا اور خط مع رجسٹری لایا۔ خط کھولا سو روپئے کی ہنڈوی پائی جو کچھ کہیے وہ ملا ایک آدمی رسید مہری لے کر کٹڑے چلا گیا۔ سو روپیے چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس چوبیس روپیے داروغہ کی معرفت اٹھے تھے وہ دیے گئے۔ پچاس روپیے محل میں بھیج دیے، چھبیس روپیے باقی رہے وہ بکس میں رکھ لیے۔ روپیہ رکھنے کے واسطے بکس کھولا تھا سو یہ رقعہ بھی لکھ لیا۔" (خطوط غالب صفحہ ۳۰)

مصارف کی یہ تقسیم بڑی منصفانہ ہے۔ چھبیس روپے جو بکس میں رکھے گئے تھے۔ وہ کام دو دن کی تواضع ہی میں صرف ہوئے ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محل میں جو رقم پہنچ جاتی تھی وہ پھر انھیں نہ ملتی ہوگی۔ مرزا تفتہ نے یہ سو روپے اس خط سے متاثر ہو کر بھیجے ہوں گے جو ۳۰ رجنوری ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا تھا جس کا یہ جملہ حسن طلب کے ذیل میں آتا ہے۔

"مئی سے پنشن نہیں پایا کہو یہ نو دس مہینے کیونکر گذرے ہوں گے انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔" (خطوط غالب صفحہ ۳۰)

غالب کے خطوط اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان سے غالب کو پہچاننے اور ان کے قریب آنے میں مدد ملتی ہے، وہ ہمیں ان کے اس قدر قریب لے آتے ہیں کہ ذرا سا فاصلہ بھی باقی نہیں رہتا سا اگر یہ کہا جائے کہ غالب کی مقبولیت کا راز ان کے

خطوط میں پنہاں ہے تو کچھ بیجا نہیں۔ ان میں غالب کی ذات کا حسن خوب نکھر کر سامنے آتا ہے۔ خطوں میں انھوں نے اپنے درد و غم اور آلام حیات کو بڑی کاریگری اور فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس بے باکی سے غالب نے اپنی کمزوریوں کو دانشگاف کیا ہے اس سے ان کی عظمت میں کمی نہیں ہوئی، اضافہ ہوا ہے۔ ان کا قد کافی بلند ہوگیا ہے۔ ایسی صاف اور بے ریا مکتوب نگاری کی مثال ان سے پہلے اور بعد کے دور میں کہیں نہیں ملتی۔ وہی اس کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مقالہ نما خطوط رقعات غالب کے برابر نہیں رکھے جا سکتے۔ سمندر کی گہرائی اور بیکراں وسعت مسلّم مگر اس میں اس آبشار کی سی سبک خرامی، نغمگی اور شوخی و رعنائی کہاں جو گلپوش وادیوں میں پورے بانکپن سے بہ رہا ہو۔ غبار خاطر کے خطوط میں لکھنے والے نے بڑا زور قلم صرف کیا ہے ان میں مولانا آزاد کی وہی رعب دار عالمانہ شخصیت جھلکتی ہے جس میں سنجیدگی ہے، وقار ہے اور چیں جبیں کا وہ عکس ہے جو بے تکلفی کے ساتھ قریب آنے اور بات کرنے سے روکتا ہے۔ آزاد کہیں اپنے علمی منصب سے نیچے نہیں آتے۔ گفتگو عربی آمیز زبان میں کرتے ہیں۔ غالب کے یہاں بے لوث حقیقت نگاری کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں وہ حسین بھی ہیں اور رنگین بھی انھیں دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ہماری دنیا اور ہمارے ماحول سے الگ کی چیزیں ہیں وہ لکھتے نہیں اپنے مکتوب الیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں۔ غالب خطوں میں نجی زندگی کی چہرہ کشائی کرتے وقت سماج اور اپنے گرد پھیلی ہوئی زندگی کے تقاضوں سے صرف نگاہ نہیں کرتے۔ ان کے مکتوبات کا سب سے بڑا وصف یہی ہے کہ وہ ذاتی جذبات و احساسات کو اس دور کے مطالبوں سے الگ اور بے تعلق نہیں ہونے دیتے۔ ان میں اس دور کی سیاسی اور تہذیبی روایات کی عکاسی بھی موجود ہے۔ وہ داخلی اور خارجی زندگی کا نہایت شفاف آئینہ ہیں۔ غالب کو فارسی شاعری اور نثر پر بڑا فخر تھا۔ اُردو شاعری اور نثر نگاری کو انھوں نے ہمیشہ دون مرتبہ خیال کیا، پنج آہنگ میں ان کا ایک فارسی خط نواب علی بہادر مسند نشین باندہ کے نام ہے اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ عرصہ سے ریختہ نہیں کہتا۔ صرف فارسی میں غزل سرائی کرتا ہوں۔ لیکن ظل الٰہی کا منشاء ہے اس لیے کبھی کبھی کہہ لیتا ہوں اسی طرح منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں

"جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں اُردو میں اپنا کمال ظاہر کر سکتا ہوں۔ اس میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے۔"

پھر انھیں کو لکھتے ہیں:

"یہاں اُردو کیا لکھوں میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اُردو کی فرمائش ہو۔"

پھر لکھتے ہیں:

"بھائی تم غور کرو اُردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معانی نازک کیوں کر بھروں گا۔"

فارسی دیوان کے متعلق کہتے ہیں:

غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے
آں دیں را کتاب ایزدی ایں بودے

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

نیست نقصان یک دو جزو است ار سواد ریختہ
کاں ذرم برگے ز نخلستان فرہنگ من است
فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اُردو کہ بے رنگ من است
فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال
مانی وارژنگم واں نسخہ ارژنگ من است
کے درخشد جوہر آئینہ تا باقیست زنگ
صیقلی آئینہ ام ایں جوہر آں زنگ من است
(غالب صفحہ ۱۶۷)

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُردو کے مختصر دیوان اور خطوط ہی کی اطاعت سے انھیں مرنے کے بعد وہ عالم گیر مقبولیت حاصل ہوئی جو کسی اور فن کار کے حصہ میں نہیں آئی دو تین جزو کا سوادِ ریختہ ان کے "ارژنگ" کو بہت نیچے چھوڑ گیا ہے اور کتاب ایزدی بن کر پوری کائنات پر چھا گیا ہے۔ غالب کی صد سالہ برسی جس شان و شوکت سے آفاق گیر پیمانہ پر منائی جا رہی ہے۔ اس میں فارسی کے نقشہائے رنگ رنگ سے زیادہ ان اشعار اور خطوط کی کارفرمائی ہے جو اردو میں لکھے گئے ہیں جن میں اپنے خیال سے وہ معانی نازک بھی نہیں بھر سکے۔ اب تک ہند و پاک میں جن رسائل نے پورے جوش و خروش کے ساتھ غالب نمبر نکالے ہیں وہ سب اُردو میں شائع ہوئے ہیں۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ فن سخن نے دین کی شکل اختیار کر لی ہے اور غالب کا اردو دیوان کتاب دین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُردو اشعار — اور خطوط ہی نے وہ دلچسپ پیکر تراشے ہیں جن میں مقبولیت کے نقش و نگار دمک رہے ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط سے اُردو نثر میں ایک انقلاب پیدا کیا ہے۔ نثر کا یہ رواں دواں ہلکا پھلکا، برجستہ اور دل نشین پیرایہ اُردو میں تو بالکل نیا تھا۔ دوسری زبانوں میں بھی اس قسم کی نثر کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ خطوط میں اس کی فطرت کا حسن بسنت رُت کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنے فطری نقوش کو چھپاتے نہیں اگر چھپانے کی کوشش بھی کرتے تو کامیابی نہ ہوتی۔ ان کی شوخ و شنگ فطرت چیل غزال کی مانند خطوط میں دوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے خمیر میں عسکریت کا گرم خون بھی شامل تھا جو ذوق جمال کے ریشمیں پردوں سے جھلک آیا ہے۔ وہ کسی کی بات نہیں سُن سکتے تھے۔ غالب کی انا کسی کو اپنے مقابل نہیں دیکھ سکتی تھی۔ انھیں حریفوں پر جھنجلاہٹ آجاتی ہے تو وہ شاہنامہ کا رزمیہ کردار بن جاتے ہیں اور ترکش کے سارے تیر چلا ڈالتے ہیں۔ یہاں تک کہ گالیاں دینے سے بھی نہیں چوکتے۔ قتیل اور چند پیش رو شعراء اور ارباب لغت سے غالب کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ قتیل کو وہ ہندو بچہ دیوانی سنگھ اور کھتری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ صاحب عالم کے نام ایک خط میں انھوں نے عبدالواسع، غیاث الدین مصنف غیاث اللغات اور محمد حسین قتیل کے لیے نہایت غیر شائستہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔

"اصل فارسی کو اس کھتری بچے قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا۔ رہا سہا غیاث الدین رام پوری نے کھو دیا ان کی سی قسمت کہاں سے لاؤں جو صاحب عالم کی نظر میں اعتبار پاؤں خالصاً للہ غور کرو کہ وہ خرانِ نامشخص کیا کہتے ہیں اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں واللہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی شعر جانتا ہے۔ میرا یہ خط پڑھو یہ نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی پڑھو قوت ممیزہ سے کام لو ان غولوں پر لعنت کرو سیدھی راہ پر آجاؤ اگر نہیں آئے تو تم جانو تمھاری بزرگی اور مرزا قتیل کی نسبت پر نظر کر کے لکھا ہے نہیں کہتا کہ خواہی نخواہی میری تحریر کو مانو مگر اس کھتری بچے سے اور اس معلّم سے مجھ کو کمتر نہ جانو۔ عربی صرف اور ہے فارسی کا قاعدہ اور ہے۔ سمجھو نہ سمجھو تم کو اختیار ہے۔ عقل کو کام فرماؤ۔ غور کرو سمجھو۔ عبدالواسع پیغمبر نہ تھا، قتیل برہمانہ تھا، واقف غوث الاعظم تھا میں یزید نہیں ہوں، شمر نہیں ہوں، مانتے ہو مانو نہ مانو تم جانو۔ (عودِ ہندی صفحہ ۱۴۱)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اور وہ الو کا پٹھا قتیل۔"

پھر قتیل کے لیے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔"

قاضی عبدالجمیل جنونؔ کو لکھتے ہیں:

"طرح بالفتح بہ معنی نمونہ اور بہ معنی فریب، پس صحیح لیکن طرح بہ تحتین اور چیز ہے۔ غیاث الدین رام پور میں ایک ملا تے مکتبی تھا ناقل ناعاقل جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہو گا اس کو فن لغت میں کیا فرجام ہو گا۔

کیستم من کہ تا ابد بزیم

لاحول ولاقوۃ یہ مصرع میرا نہیں، تا ابد بزیم یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے۔"

نواب انوار الدولہ شفقؔ کے خط کا اقتباس دیکھیے:

"غیاث اللغات ایک نام موقر و معزز جیسے الغریہ خواہ مخواہ مرد آدمی آپ جانتے ہیں کہ یہ کون ہے؟ ایک معلم فرومایہ رام پور کا رہنے والا فارسی سے آشنائے محض اور صرف و نحو میں تمام انشائے خلیفہ و منشیات مادھو رام کا پڑھانے والا۔ چنانچہ دیباچہ میں اپنا ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھو رام و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے یہ لوگ راہ سخن کے غول ہیں۔ آدمی کے گمراہ کرنے والے یہ فارسی کو کیا جانیں ہاں طبع موزوں رکھتے تھے شعر کہتے تھے۔"

غالب مخالفین پر ہر زاویہ سے وار کرتے تھے وہ جنگ اور محبت میں کسی چیز کو ناجائز نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے گلی سڑی لاشوں پر بھی ناوک فگنی کی ہے۔ قتیل کے شاگرد ان حملوں کو برداشت نہ کر سکے انھوں نے ہنگامہ بپا کر دیا مجبوراً غالب کو دوسرے ناموں سے کتابیں چھپوانی پڑیں۔ اس علمی ادبی، شعری اور لغوی جنگ میں غالب کے جسم پر چڑھے ہوئے بہت سے خول اتر گئے ان کی انا کو سخت صدمہ پہنچا پھر بھی وہ دل ناتواں کی طرح مقابلے پر ڈٹے رہے۔ غالب ان لوگوں پر اظہار برہمی کر رہے تھے جو دنیا میں موجود نہیں تھے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے اس خفگی اور اشتعال کا جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ جو الفاظ انھوں نے قتیل کے لیے استعمال کیے ہیں وہ سراسر قابل اعتراض ہیں۔

قتیل کوئی معمولی شخص نہ تھے وہ بڑے خوش اخلاق اور خدادوست تھے ایرانی زبان اور معاشرت سے خوب واقف تھے۔ تاریخ، عروض، قافیہ، الہیات، ریاضیات اور فارسی میں بہت اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ صاحبِ تصنیف تھے۔ ایران اور اس کے مختلف صوبوں کے محاورات سے واقف تھے۔ انھوں نے ایران کا سفر کیا تھا اور محاوروں کی تحقیق کے سلسلہ میں شیراز، اصفہان، طہران اور آذربائیجان تک گئے تھے وہاں قیام بھی کیا تھا۔ دیہات کی خاک چھانی تھی۔ انھیں فارسی ادب پر ایسی قدرت حاصل تھی کہ اہلِ زبان بھی رشک کرتے تھے۔ البتہ غالب قتیل کے کمالاتِ علمی کا اعتراف نہیں کرتے اور ان کی شان میں بڑے ناشائستہ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ غالب کو گالیاں دینے کی عادت تھی ان کے خطوط میں گالیوں کی بوچھاڑ نظر آتی ہے۔

"میاں وہ قاضی چوتیا تو مسخرہ ہے۔" (غالب کی شوخیاں)

"ترحم پہ ہے تو تغافل کیا ہوگا میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کا روشناس پشم نہیں اکھیڑ سکتا۔" (جہانِ غالب)

شہاب الدین خاں ثاقب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں خدا جانے کس ولدالزنا نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیہ پر ہوں تو میرے نہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں تو یوں سمجھا کہ کسی ملعون زن جنب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مقصد کے یہ شعر ہیں اوس کے باپ پر اور دادا پر اور پردادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولدالحرام۔

(جہانِ غالب، بھارت ایڈیشن صفحہ ۸۳)

غیظ و غضب کے عالم میں جو کچھ غالب کی زبان پر ہوتا ہے وہی قلم پر آجاتا ہے۔ ان کی زبان اور قلم کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں، بلکہ لکھتے وقت دل کے بطون بھی کھل جاتے ہیں اور سیرت عریاں ہو جاتی ہے۔ یہ خصوصیت کسی اور مکتوب نگار کے خطوط میں نہیں ملتی۔ خط عام طور پر دلی جذبات کا ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں دل کے سارے بھید نمایاں ہو جاتے ہیں لکھنے والے کے کردار، اس کے نظریات اور ماحول کی جملہ خصوصیات عیاں ہو جاتی ہیں لیکن غالب میں اسرارِ حیات پر سے نقاب اُٹھانے کی جرأتِ رندانہ بہت زیادہ ہے۔ یہ جرأت اور بے باکی ان کے ضمیر میں شامل ہے۔

غالب اپنے نسب پر بھی فخر کرتے ہیں اور فارسی دانی پر بھی فارسی میں انھیں محقق ہونے کا دعویٰ ہے۔ ان کی ذات میں انانیت کارفرما تھی جس کا عکس نظم و نثر دونوں پر پڑا ہے۔ چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں کہتے ہیں:

من خود عدیل خویشم و نبود عدیل من

چوں خود مرا بہ غصہ فنا کرد روزگار

عمر ہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ

چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :

"بھائی میں فارسی کا محقق ہوں ۔"

پھر انھیں کو لکھتے ہیں :

"فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے ۔" نہ صرف شاعری بلکہ تصوف ، نجوم اور حکمت میں بھی غالب کو یکتائی کا دعویٰ تھا ۔

"ہم چو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم نیست ۔ ذرد ہر قلم مدعی و نکتہ گو اہست لوحش اللہ گہر افشانی نال قلم یارب آبشخور ایں ابر کدامی دریا معاست ۔"

ان کی انانیت اور ایگو کا پورا احترام کرتے ہوئے کہنا پڑتا ہے کہ غالب کا ہر دعویٰ تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کی ان باتوں میں شاعرانہ فخر و تعلی اور مبالغہ کا پہلو زیادہ ہے ۔ پھر بھی ان کے کمالات سے انکار ممکن نہیں ۔

غالب کی شاعرانہ تعلیوں اور غیظ و غضب کی وجہ سے ان کے اکثر معاصرین سخت آزردہ رہے ۔ اگر یہ صورتِ حال رونما نہ ہوتی اور جنگ و جدال کا وہ میدان گرم نہ ہوتا جس نے غالب کے اکثر دعووں کو غلط ثابت کر دیا تو غالب کی وہ کمزوریاں سامنے نہ آتیں جن سے ان کی علمی سطح ذرا پست نظر آتی ہے ۔ علمی مباحث کے دوران میں غالب توازن برقرار نہیں رکھ سکے اور اعتدال کی حدود سے بہت آگے بڑھ گئے ۔ انھوں نے اپنے مخالفین کو صفحۂ دنیا سے مٹا دینے کا قصد کر لیا تھا ۔ برہان قاطع کے مصنف کی نسبت ارشاد ہوتا ہے ۔

برانم بہ نیروئے ایں تیغ تیز
کہ مغز عدو را کنم ریز ریز
عدو آں کہ برہان قاطع نوشت
بگفتار سست و بہ ہنجار زشت

غالب میں احساس برتری ذرا زیادہ ہی تھا ۔ وہ دوسرے شعراء اور محققین کے مقابلہ میں اپنی بالادستی کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے ۔ مختلف طریقوں سے اپنی بلندیٔ مراتب کا اعتراف کرانے کی فکر میں رہتے تھے ۔ مرزا تفتہ کے نام کا ایک خط دیکھیے :

"کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔"

اس میں شک نہیں کہ غالب کی شاعری ردیف و قوافی کے گرد نہیں گھومتی وہ فکر و خیال کی بلندیوں اور پہنائیوں کو ناپتی ہے ۔ انھوں نے رسم عام کی تقلید کبھی نہ کی ۔ پھر بھی اس سلسلہ میں دوسرے شعراء کا ذکر خود ان کے قلم سے اچھا نہیں لگتا ۔ منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں :

"رات کو ایک غزل کئی برس کے بعد لکھی ہے۔ اب صبح دم تم کو لکھتا ہوں خدا کے واسطے غور کرنا کہ غزل اس کو کہتے ہیں":
غزل بہت ہی شگفتہ اور بلند پایہ ہے البتہ اپنے آپ کو سراہنے کے انداز میں عامیانہ پن جھلک رہا ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ چند شعر یہاں نہ لکھے جائیں:

اے ذوقِ نوا سنجی بازم بخروش آور
غوغائے شبخونے بر بنگہ ہوش آور
گر خوں بچکد از سر از دیدہ فرو بارم
دل خوں کن و آں خوں را در سینہ بجوش آور
دانم کہ زرے داری ہر جا گذرے داری
مے گر ندہد سلطاں از بادہ فروش آور
ریحاں دمد از مینا رامش چکد از قلقل
آں در رہِ چشم افگن ایں از پئے گوش آور
گاہے بہ سبک دستی از بادہ زخویشم بر
گاہے بہ سیہ مستی از نغمہ بہ ہوش آور

اس دور میں فارسی کی ایسی غزل غالب کے سوا اور کون کہہ سکتا تھا۔

غالب کو لوازم امارت سے بے حد دلچسپی تھی دولت و ثروت ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھی مگر وہ ایک پندار کا شکار تھے۔ وقار امارت کا جو تصور ان کے ذہن میں تھا اس کی بنیاد صرف وہ خطابات تھے جن کی حیثیت کھوٹے سکے سے زیادہ نہ تھی۔ غالب ان سکوں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ منشی شیو نرائن کے نام کا ایک خط دیکھیے جس سے خطابات کے ساتھ ان کی گرویدگی کا اظہار ہوتا ہے:

"سنو میری جان نوابی کا مجھ کو خطاب ہے۔ نجم الدولہ اور اطراف و جوانب کے امراء سب مجھ کو نواب لکھتے ہیں بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کمشنر بہادر دہلی نے جواب ان دنوں میں ایک روبکاری بھیجی ہے تو لفافہ پر نواب اسد اللہ خاں لکھا لیکن یاد رہے نواب کے لفظ کے ساتھ مرزا یا میر نہیں لکھتے یہ خلافِ دستور ہے یا نواب اسد اللہ خاں لکھو یا مرزا اسد اللہ خاں لکھو اور بہادر کا لفظ تو دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔"

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

"منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں نام اور تخلص بس اجزائے خطابی کا لکھنا نامناسب بلکہ مضر ہے مگر ہاں نام کے بعد لفظ بہادر کا اور بہادر کے لفظ کے بعد تخلص اسد اللہ خاں بہادر غالب۔"

ان باتوں کو ایک طرح کا حسنِ فریب یا فریبِ حسن ہی سمجھنا چاہیے جس سے وہ صرف اپنے احساس کو تسکین دینا

چاہتے ہیں ورنہ نواب یا بہادر کا لفظ ان کے معاشی و اقتصادی حالات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس وقت وہ مصلحتاً اجزائے خطابی کا اخفا تو ضروری سمجھ رہے ہیں۔ رہا لفظ بہادر تو اس میں کوئی حقیقت نہیں۔ ان کے اسلاف کا پیشہ سپہ گری ضرور تھا لیکن غالب نے کبھی میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت نہیں دی۔ محض الفاظ کی جادوگری سے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے بزرگوں نے شمشیر زنی سے عزت حاصل کی تھی اور غالب کو صرف شاعری اور نثر نگاری کی بدولت وہ حقیقی عزت اور شہرت میسر آئی جو ان کے کسی حریف یا ہمعصر کو نہیں مل سکی۔ غالب کا یہ خیال کہ صرف شاعری ہی ان کے لیے ذریعۂ عزت نہیں صحیح نہیں سمجھا جا سکتا در حقیقت انھیں صرف شاعری ہی سے اعزاز حاصل ہوا اور نہ تلوار کے جوہر دکھانے کا کبھی موقعہ نہیں ملا وہ خود لکھتے ہیں:

دل دوست تیغ آزمائی نہ دارم

رہ و رسم کشور کشائی نہ دانم

آبا و اجداد نے میدان کارزار میں دادِ شجاعت دے کر جاگیر حاصل کر لی تھی اس سے غالب کو بھی فائدہ پہنچتا رہا۔ وہ ضبط بھی ہوئی شاعری کی بدولت انھیں جس جاگیر پر قبضہ ملا تھا وہ آج تک باقی ہے اس میں غالب کی بہادری اور نوابی کے پرچم بدستور لہرا رہے ہیں۔ جاگیر کی آمدنی اتنی نہ تھی کہ وہ امیرانہ شان و شوکت سے زندگی گذار سکتے ان کی معاش کا وسیلہ صرف شاعری تھی۔ نثر نگاری سے بھی انھیں فائدہ پہنچا۔ دستنبو لکھ کر غالب نے غدر کے بعد انگریزوں کی توجہ مبذول کر لی اور خطوط لکھ کر احباب سے امداد لیتے رہے۔ سخن فروشی اور صلہ جوئی کا یہ ڈھنگ فارسی خطوط میں بھی ملتا ہے۔ مولوی کرم حسین خاں سفیر شاہ اودھ کے نام ایک خط دیکھیے جو پنج آہنگ کے صفحہ ۱۰۴ سے شروع ہو کر ۱۰۵ پر ختم ہوا ہے۔

قبلہ حاجات، نوید قبول کہ برادر صاحب مشفق فخر الدولہ نواب امین الدین احمد خاں بہادر فرستادہ اند دل لولۂ گذارش سپاس در ضمیر افگند وصلائی برمائدۂ کرم حوصلۂ آز گدا را خوانی بخشید لاجرم در طلب نفقد ابرام میرود و بدریوزہ گری نام بفضولی برادر وہ میشود قبلہ و کعبۂ مرا خاطر نشان یاد کہ انچہ من در صلۂ نگارش ایں قطعہ دست مزد خویش میشمرم روشناسی خرد است و تشریف قبول و نوید التفات و عطیۂ فتوح اما کشایش طلسم ایں مدعا در گرد آنست کہ پایۂ مقام ستایش گر بحضرت ممدوح برشمردہ شود تا باندازہ ارزش دی عطا تواند کرد ورنہ پیداست کہ جائزہ بادخوانان تا چہ قدر است و آبروئی مدح گستران تا کجا اندیشہ فتوی میدہد و فرد باور میکند کہ پیدائی ایں مراتب باندازۂ گفتار سبحان علی خاں صاحب نباشد چہ ایشاں آبروئی خاکسار یائی سائل در نظر ندارند و جز شاعر صلہ جوئی نشمارند اگر مخدوم مرا سر بیکسی نوازیست قطعہ در فورد عرضداشت شاہی فرم پیچند و اینچہ نامہ نگار درخور دانند کما بیش فرمایند تا بنظر سلطان گرامی گردیدہ باشم و ہم بہ برگ و نوا رسیدہ انصاف بالائی طاعت است اگرچہ پایۂ فرماندہ اودھ بالا تراز انست کہ چون منی لب بہ ستایش تواند کشود لیکن من ہم دریں شیوہ کہ عبارت از ثنا خوانی و سخن فروشی است ننگ مدومان خویشم و از خجلت ناکسی سر در پیش چنانکہ عرفی فرماید۔

فرزند و دمانِ اسیلم ہیں وہم بس

کہ نہ رم ایں سخنم خوئی زچہرہ بیروں داد

بالجملہ سپاس از بخت دارم کہ مرجع من صاحب خلقِ عظیم ومرا اندریں آرزو کار باکریم است ۔

(پنج آہنگ کشوری صفحہ ۱۰۴)

ان تحریروں کی موجودگی میں غالبؔ محض خطابات اور انگریزدوستی کی طاقت سے اپنا نام فن کاروں کی اُس فہرست میں درج نہیں کرا سکتے جس میں حکیم مومن سب سے اوپر ہیں، غالبؔ شروع ہی سے اعزہ کے دست نگر رہے آگے چل کر اس عادت نے انھیں احباب اور ممدوحین سے امداد طلب کرنے کا خوگر بنا دیا۔ اس عادت پر غالب کو بھی افسوس ہے جس کا اظہار انھوں نے کلیات نظم فارسی میں اسی طرح کیا ہے۔

"شادم از آزادی کہ بساسخن بہ ہنجار عشق باز اں گزاردستم و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بہ کردار دنیا طلبگاں در مدح اہل جاہ سیاہ کردم۔

اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ تونگرستائی اور دریوزہ گری کو مستحسن نہیں سمجھتے تھے ان کے خمیر میں زندگی تھی مگر ضروریات حیات کا دائرہ اتنا پھیل گیا تھا کہ بغیر مدح و ستائش کے کام نہیں چل سکتا تھا۔ نواب علاء الدین کو لکھتے ہیں :

" روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر یا ایں ہمہ کبھی خان (نواب احمد بخش خاں) نے کچھ دیا اور کبھی الور سے دلایا کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا "

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :

"یہ تمھارا دعا گو اگرچہ اور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے۔ یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی۔ تمھاری ہمت پر سو ہزار آفرین ہے۔ جے پور سے مجھ کو اگر دو ہزار ہاتھ آجاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا۔

خواجہ غلام غوث بے خبر کو تحریر فرماتے ہیں :

"قبلہ کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالبؔ کہلاتا ہے۔ وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیونکر جیتا ہے۔ پنشن قدیم اکیس ماہ سے بند اور میں سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند۔

نواب یوسف علی خاں کو لکھتے ہیں :

"تو آپ بن مانگے دیں اس کے لینے میں مجھے انکار نہیں اور جب مجھ کو حالت آپڑے تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔ بار گراں غم سے پست ہو گیا ہوں آگے تنگ دست تھا اب تہی دست ہو گیا ہوں۔ جلد میری خبر لیجیے اور کچھ بھجوا دیجیے۔"

دوسرے خط میں رقمطراز ہیں :

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت۔ آداب نیاز بجا لاکر عرض کرتا ہوں کہ سو روپئے کی ہنڈوی بابت مصارف
ماہ نومبر ۱۸۵۹ء پہنچی اور روپیہ دبتغرض وصول میں آیا اور صرف ہوگیا اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے
نہ کہوں تو کس سے کہوں؟ اس مشاہرہ مقرری سے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجھ کو اور بھیج دیجے گا تو جلا بھیجے گا لیکن
اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہ ہو اور بہت جلد مرحمت ہو۔"

غالب کو زندگی میں فراغت میسر نہیں آئی اس کا سبب یہ تھا کہ وہ بیکاری اور بے عملی میں بھی رئیسانہ انداز سے رہتے تھے
نوکروں کو الگ کرنا کسر شان خیال کرتے تھے۔ شراب اور کباب سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔ شراب بھی وہی پسند کرتے تھے
جو خوش ذائقہ اور خوش رنگ ہو۔ یہ سب ضروریات قرض سے پوری ہوتی تھیں جس کا چکر کبھی ختم نہیں ہوسکا اس کی بدولت
ان کی رسوائی بھی ہوئی۔ کہیں سے روپیہ آجاتا تو قرض کا بوجھ ہلکا ہوجاتا لیکن پھر اس کا وزن بڑھنے لگتا۔ غالب خوش دہندہ ضرور
تھے قرض کا بار ان کے احساس پر ہر وقت رکھا رہتا تھا ادا کرنے کی فکر ہر لمحہ دامنگیر رہتی تھی۔ آخری لمحات میں انھوں نے نواب
یوسف علی خاں کو جو خط لکھا ہے اس میں بھی قرض کا تذکرہ ہے:

"آخر عمر میں تین التجائیں ہیں۔ آپ سے ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو کا قرض رکھتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ
میری زندگی میں ادا ہو جائے اور یہ سو روپیہ مہینا جو مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے حین حیات قرار
پائے۔ یہ دو خواہشیں میری زندگی میں خواہ میرے بعد اجرا پائیں۔

تم سلامت رہو ہزار برس

دولت و عز و جاہ روز افزوں

اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قرض ادا کرنا کس قدر ضروری خیال کرتے تھے اور حسین علی خاں سے انھیں کتنی
محبت تھی ان کے حقوق کو وہ اپنے بھائی کی یتیم اور لاوارث اولاد کے حقوق پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ مرزا یوسف کی وفات
کے بعد ان کے بچوں کی خبر گیری غالب ہی کے فرائض میں تھی لیکن انھوں نے اس سلسلہ میں کچھ نہیں کیا جس کا ثبوت اس
تحریر سے ملتا ہے:

"حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مرگیا۔ اس کی بیٹی اس کے چار بچے اس کی ماں میری بھاوج جے پور میں
پڑے ہوتے ہیں اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا۔ بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی چچا ہے۔"

غالب کی مالی حالت اس وقت یقیناً اچھی نہ تھی لیکن اگر وہ اپنے متعلقین کی خاطر ایثار کر کے اور لوازم امارت میں
کمی کر دیتے تو ان فرائض سے عہدہ برا ہو سکتے تھے۔ غالب کا سب سے بڑا وصف ان کی بیباکی اور صاف بیانی ہے وہ نجی
زندگی کے ایسے واقعات بھی بیان کر جاتے ہیں جن کو آسانی سے چھپا سکتے تھے۔ ان کی بیباک فطرت کسی راز پر نقاب ڈالنا
پسند نہیں کرتی وہ جسم کے ہر داغ اور زخم کو نمایاں کر دیتے ہیں وہ اس جرأت سے کام نہ لیتے تو ان کی زندگی کے بہت
سے اہم واقعات ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہوتے اور ان کی بہت سی اخلاقی اور انسانی کمزوریاں پردۂ راز ہی میں رہ جاتیں۔

اس وقت ان کا انسانی قد اتنا بلند نہ ہوتا نہ ادبی شخصیت اس قدر قدآور ہوتی۔ غالب انسان تھے انھیں اپنی انسانیت پر فخر و اعتماد تھا۔ یہ انسانیت حسین بھی تھی اور بدصورت بھی۔ اس تضاد ہی کو غالب انسان کا ورثہ اور اس کے ارتقا کی بنیاد خیال کرتے تھے اس دنیا میں پیغمبر بن کر جینا کوئی بڑی بات نہیں۔ آدمی کی طرح رہنا اور غلطیاں کرنا، انھیں محسوس کرنا اور آدمیت کی سطح کو بلند کرنے کی دھن میں لگے رہنا بہت زیادہ قابلِ تعریف ہے جو لوگ غالب کو پیغمبر سمجھ کر ان کی داغدار قبا کے سارے دھبّے دھو دینا چاہتے ہیں وہ ان کی انسانی سطح کو پست کرتے ہیں۔ غالب کے خطوط اور ان کے انداز نگارش میں جو دلکشی اور رعنائی پائی جاتی ہے وہ اسی بے باک نگاری کی دین ہے اسی بے باکی نے مضامین کی آمد کے لیے ان کے دماغ کی وہ کھڑکیاں کھول دی ہیں جن کی راہ سے غیب کی آوازیں اندر داخل ہو کر خیال کے پردوں سے ٹکرانے لگتی تھیں۔ ان آوازوں کا مرتبہ کسی طرح ابہام سے کم نہ تھا۔ اکثر اکابر نے اپنی حقیقی شخصیت کو چھپانے کی کوشش کی ہے اور خلوت و جلوت کے فاصلوں کو بڑھانا چاہا ہے۔ اپنے حسب و نسب اور خاندانی افلاس کے اظہار کو وہ گناہ تصوّر کرتے ہیں۔ علامہ شبلی کی حیاتِ معاشقہ میں عوام کے لیے جو کشش ہو سکتی تھی وہ جبّہ و دستار اور زاہدانہ زندگی میں بالکل نہ تھی لیکن انھوں نے فطرت کے اسی خوبصورت، نازک اور دلکش پہلو کو دامنِ قبا سے ڈھانکنے کی سعی فرمائی۔ جب یہ رومانی حالات ظاہر ہوئے تو علامہ شبلی کی شاعرانہ شخصیت کا حسن اور زیادہ نکھر گیا۔ غالب اپنے اسلاف اور معاصرین میں اس حیثیت سے نہایت ممتاز ہیں کہ انھوں نے کوئی بات چھپائی نہیں وہ ستم پیشہ ڈومنی کی عشقیہ داستان کو بھی شعر کا لباس پہناتے ہیں اور شراب نوشی کے واقعات بھی بے تکلف بیان کرتے ہیں۔ کباب شراب میں بھگو کر کھاتے ہیں اور اس کے ذائقہ سے اپنے پڑھنے والوں کو بھی محظوظ کرتے ہیں۔ ڈومنی کی موت پر غالب نے اپنے تاثرات کو جس دردناک لب و لہجہ میں ظاہر کیا ہے اس سے ان کے دلِ بے تاب کی ساری جراحتیں کھل جاتی ہیں ان سے خون بہتا دکھائی دیتا ہے۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اِسے ناسازگاری ہائے ہائے

اس دلخراش مرثیہ کے ہر شعر میں غالب کے دل کی صدائے شکست گریختی محسوس ہوتی ہے۔ یہی ذوقِ جمال تھا جس نے انھیں ایک بڑا شاعر بنایا۔ یہ چنگاری احساس میں ہر لمحہ نہ سلگتی رہتی تو ایسے دلگداز اشعار کبھی نہ کہہ سکتے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں　　روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

جن محاورہ بند شعراء کے سینہ میں دل کی جگہ سنگ وخشت کر لی گئی تھی وہ صرف تاریخ میں بند ہو کر رہ گئے۔ موجودہ نسل کے دلوں تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔

بہرکیف غالب کے خطوط مختلف اور متضاد خصوصیات کی بنا پر اُردو ادب میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں ان سے ان کی اپنی زندگی کے علاوہ اس دور کے بہت سے حادثات اور واقعات کا پوری جزئیات کے ساتھ علم ہو جاتا ہے شگفتگی، سادگی، صفائی، رنگینی اور پُرکاری کا جو حسن ان خطوط میں پایا جاتا ہے۔ اس میں کشمیر کی وادیوں کا سا جلال وجمال پایا جاتا ہے۔ ان چیزوں نے غالب کے خطوط کو ادبی تخلیق کا منصب عطا کیا ہے۔ غالب نے زندگی کی داخلی کشمکش اور اپنے ماحول کی نیز حیات اجتماعی کی بڑی خوبصورت تصاویر پیش کی ہیں جو متحرک بھی ہیں اور طاقت گفتار بھی رکھتی ہیں۔ انھوں نے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات سے بھی صرف نظر نہیں کیا ہے۔ غدر کے واقعات سے وہ بظاہر الگ ضرور رہے۔ اتنی احتیاط بھی برتی کہ بھائی کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے۔ دستنبو لکھ کر اسے انگریزوں کی حضور میں شفاعت اور رستگاری کا وسیلہ بنایا اس کی ترتیب میں یہ لحاظ بھی رکھا کہ واقعات کا سلسلہ بادشاہ کی گرفتاری اور جلاوطنی تک نہ پہنچ سکے۔ ماحول اسی قسم کا تھا کہ انھیں اتنا ہی ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے تھا لیکن ان کا دل دِلّی کی تباہی پر رویا ضرور ہے۔ انھیں اپنے احباب اور اعزّہ کے بچھڑنے اور دِلّی کی محفلوں کے برہم ہونے کا احساس بھی ہے۔ ان کے دو طویل خطوط اس سلسلہ میں پیش کیے جاتے ہیں:

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

”صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقع ہوا۔ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر ومحبت درپیش آئے شعر کہے، دیوان جمع کیے اوسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمہارے دوست تھے اور منشی نبی بخش اون کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط بعد مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و تخلص بہ تفتہ ہو آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں اوس کا نام بھی دِلّی اور اوس محلّے کا نام بلّی ماروں کا محلّہ ہے۔ لیکن ایک دوست اوس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا واللہ! ڈھونڈھنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب پوچھو کہ تو کیونکر مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں تو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں۔ راجہ نرندر سنگھ بہادر والیٔ پٹیالہ کے راجہ نے صاحبان عالیشان سے عہد لیا تھا کہ بروقت غارت دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں

اور یہ شہر کہاں بمبالغہ نہ جاننا ۔امیر غریب ۔سب نکل گئے جو رہ گئے تھے وہ نکالے گئے ۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے ۔مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں ۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور داروگیر میں مبتلا ہیں ۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامہ میں شریک رہے ہیں میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں ۔ خواہے اس کو نوکری سمجھو خواہے مزدوری جانو اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا ۔میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی لہٰذا طلبی نہیں ہوئی ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آتے ہیں میری کیا حقیقت تھی ۔غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا ، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے ۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون جو آوے گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں ۔مجرم سیاست پائے جاتے ہیں ۔جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی پنجشنبہ دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے ۔کچھ نیک و بند کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں ۔دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے ۔یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا ابھی دیکھا چاہیے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں ۔"

یہ ہے نقشہ اس جنگِ آزادی کا جس کو ہم بجا طور پر آزادی کی لڑائی کہتے ہیں ایسی بہت سی باتیں تاریخ میں بھی مل سکتی ہیں مگر ان باتوں میں وہ دل نہیں دھڑکتا جو غالب کے اس خط میں تڑپ رہا ہے غالب ڈرتے جاتے ہیں اور لکھتے جاتے ہیں اپنے تحفظ کا بندوبست وہ بہت پہلے سے کرتے رہے ہیں ۔اس کے باوجود یہ احتیاط ظاہر کرتی ہے وہ کسی طرح اس رستخیز میں اپنا نام لکھوانا نہیں چاہتے ۔ان کا یہ مخصوص مزاج کہ جنگِ آزادی کے سپاہیوں کو مجرم تصور کریں ۔ان کی انگریز پسندی کی دین ہے ۔

دوسرا خط نواب انوارالدولہ شفق کو لکھا گیا ہے اس کا سن تحریر ۱۸۶۱ء ہے پہلا خط ۱۸۵۷ء میں لکھا گیا ہے ۔

"پانچ لشکر کا حملہ پے در پے اس شہر پر ہوا ۔پہلا باغیوں کا لشکر اوس میں اہل شہر کا اعتبار لٹا ۔ دوسرا لشکر خاکیوں کا ۔ اوس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے ۔تیسرا لشکر کال کا ۔اوس میں ہزارہا آدمی بھوکے مرے چوتھا لشکر ہیضے کا ۔اوس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے ۔پانچواں لشکر تپ کا ۔ اوس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی مرے آدمی کم لیکن جس کو تپ آئی اوس نے پھر اعضا میں طاقت نہ پائی ۔اب تک اس لشکر نے شہر سے کوچ نہیں کیا ۔میرے گھر میں دو آدمی تپ میں مبتلا ہیں ۔ایک بڑا لڑکا اور ایک میرا داروغہ خدا ان دونوں کو جلد صحت دے ۔ برسات یہاں بھی اچھی ہوئی ہے ۔لیکن نہ ایسی کہ جیسی کالپی اور بنارس میں زمیندار خوش کھیتیاں تیار ہیں ۔خریف کا بیڑا پار ہے ۔ربیع کے واسطے پوہ ماہ میں مینہ درکار ہے ۔کتاب کا پارسل پرسوں ارسال کیا جائے گا ۔

"آہاہا جناب حافظ محمد بخش صاحب میری بندگی مغل علی خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستسقی ہو کر مر گئے ہے ہے کیوں کر

لکھوں حکیم رضی الدین خاں کو قتل عام میں ایک خاکی نے گولی مار دی اور احمد حسین خاں اون کے چھوٹے بھائی اوسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے غدر کے سبب جا نہ سکے یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں زندہ ہیں۔ پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے۔ میر چھوٹم نے بھی پھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر کے بھاگے تھے وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑودے میں رہے اورنگ آباد میں رہے، حیدرآباد میں رہے۔ سال گزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے سرکار سے اون کی صفائی ہو گئی لیکن صرف جاں بخشی روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں مغل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی قرار پاکر ضبط ہوتی اور نیلام ہو کر روپیہ سرکار میں داخل ہو گیا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام ہیں وہ اون کو یعنی نظام الدین کی والدہ کو مل گئی ہے۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن گئے ہیں شاید بہاولپور بھی جائیں گے۔

یہ زمانہ وہ تھا جب زندگی بہت بے اعتبار اور صحیح معنی میں نقش بر آب ہو گئی تھی۔ فاتح مفتوح کی روایات کو مٹانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ان نقوش کو محو کیا جا رہا تھا جو پرانے سماج میں قائم ہوئے تھے۔ دوستی اور دشمنی کے نئے معیار سامنے آ رہے تھے۔ غالب کے ان خطوط میں دیسی چیزیں نظر آتی ہیں۔ موسمی حالات پر بھی ہلکا سا تبصرہ ہے۔ ان کی وہ نگاہ جو زندگی سے مانوس ہے اس کے ہر پہلو پر پڑ رہی ہے غالب نے جن معمولی باتوں کا ذکر کیا ہے وہ کسی تاریخ میں نہ ملیں گی۔ غالب کے خطوط صحیح معنی میں اس دور کا ایسا آئینہ ہیں جنھیں سب کچھ نظر آ رہا ہے۔ گھریلو حالات کو بھی انھوں نے آپ بیتی کے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:

"تپ کی بڑی شدت ہے دونوں لڑکوں کو تپ آتی ہے بڑے کو اتوار سے کہ آج بدھ چوتھا دن ہے چھوٹے کو پیر سے کہ آج تیسرا دن ہے۔ مغلانی متوفیہ کی جگہ جو مغلانی رکھی گئی تھی وہ تپ زدہ ہو کر سراسیمہ اپنے گھر گئی۔ میرا ایک خدمتگار غلام حسین نام تپ میں پڑا ہے۔"

منشی نبی بخش ہی کے دوسرے خط کا ایک ٹکڑا اور دیکھیے:

"تم کو خبر دیتا ہوں کہ زین العابدین کی ماں یعنی دادی حسین علی خاں کی پنجشنبہ کے دن ۲۸ رمضان کو مر گئی زین العابدین کا بڑا بیٹا باقر علی خاں وہ بھی میرے پاس آ گیا۔ دیکھتے ہو بھائی چرخ ستمگر کیا شعبدہ بازیاں کر رہا ہے۔ بوجھ پر بوجھ مجھ پر ڈال رہا ہے، زخم پر زخم مجھ پر لگا رہا ہے کچھ بن نہیں آتی۔ آمد وہی مصارف بڑھ گئے۔ اگر مثلاً بے مروتی اور خدا ناترسی کروں تو کیسے کس سے کہوں کہ توان لڑکوں کو سنبھال مجھ میں مقدور نہیں۔ بہر حال چپ ہوں اور متحیر ہوں۔ خدا میری شرم رکھے۔"

غالب کے معاصرین میں بہت کم لوگ ہوں گے جن کے حالات اندر اور باہر کے اتنی تفصیل سے ہمیں معلوم ہوں۔ غالب شاعر تھے لیکن ان کے قلم میں تاریخ نگاری، آپ بیتی اور سماجی حالات لکھنے کا بھی عمدہ سلیقہ تھا۔ کہیں کہیں صحافت کا رنگ بھی ابھر آیا ہے۔ غالب اپنی شاعری اور نثر نگاری میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور اس حیران ظریف کی مسکراہٹیں رہتی دنیا تک مغموم دلوں میں ہنسنے کی امنگیں پیدا کرتی رہیں گی۔